اداریہ

# ہم کدھر جا رہے ہیں؟

مثنوی، مولانا جلال الدین رومی میں آیا ہے کہ ایک دفعہ ایک مولوی صاحب کشتی میں سوار ہوئے تو ملاح سے پوچھا کیا تم نے صرف ونحو پڑھی ہے؟ حضور! میں اَن پڑھ ہوں، صرف ونحو کا علم نہیں رکھتا، ملاح نے کہا۔ افسوس! تم نے اپنی آدھی عمر برباد کر ڈالی، مولوی صاحب نے کہا۔ یاد رہے برصغیر کے علمائے کرام کو عربی زبان کی گرائمر (صرف ونحو) کی درس و تدریس سے گہرا شغف رہا ہے۔

کشتی دریا کی لہروں پر رواں دواں تھی کہ اچانک بھنور میں آ گئی۔ ملاح نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ حضرت! تیرنا آتا ہے؟ نہیں! مولوی صاحب نے جواب دیا۔ یہ سُن کر ملاح بولا افسوس! آپ نے ساری عمر برباد کر ڈالی۔

مولانا رومیؒ صحیح معنی میں درویش خدا مست ہیں، زندگی بھر انسانی روح کے مسائل سلجھاتے رہے۔ آج بھی ان کے الہامی کلام سے بے قرار روحیں تسکین پاتی ہیں۔ امریکہ میں انہیں بہت پڑھا جا رہا ہے۔ برصغیر کے علمائے ربانی مثنوی کو باوضو پڑھتے ہیں۔ رومیؒ کا کہنا ہے کہ اگر انسان جسے ہر لحظہ زندگی میں نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اپنے مسائل کا حل تلاش نہ کر سکے، تو ایسے بے سود علم سے کیا فائدہ؟

ایک حدیثِ مبارکہ میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''خدایا میں ایسے علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو سودمند نہیں ہے اور ایسے دل سے جو خدا کے سامنے جھکتا نہیں، اور ایسے جی سے جو سیر نہیں ہوتا۔''(۱)

(۱) اللھم انی اعوذ بک، من علم لا ینفع، من قلب لا یخشع و من نفس لا تشبع۔ (صحیح مسلم اور سنن ترمذی)

آج پاکستان اپنی عمر کے ۵۸ سال پورے کر چکا ہے۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہم اپنے اجتماعی اور معاشی مسائل پُر امن جمہوری طریق سے حل نہ کر سکے۔ چنانچہ وطنِ عزیز میں نہ تو جمہوری روایات کو فروغ ملا اور نہ ہی ہمارے معاشی مسائل حل ہوئے۔ آج ہمارے عوام کی ایک بڑی تعداد خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے اور ایسے ہی تعلیم و تربیت میں بھی ہمارا شمار پس ماندہ اقوام میں ہوتا ہے۔ جہاں تک ہمارے اخلاقی مسائل کا تعلق ہے تو اس میدان میں تو صد رسوائی ہمارے حصے میں آئی ہے۔ حال ہی میں ہم نے مختاراں مائی اور شیخوپورہ، سرگودھا اور دوسرے مقامات پر اپنی بہنوں کے ساتھ جو شرم ناک سلوک کیا ہے، اس پر نہ صرف پوری سوسائٹی تڑپ تڑپ اُٹھی ہے بلکہ ساری دُنیا میں ہمارا اخلاقی فساد زیرِ بحث رہا۔ ہمیں یہ بھی پتہ نہیں کہ ہمارے قانون نے ان اخلاقی مجرموں کی گرفت کس حد تک کی ہے؟

بلوچستان یونیورسٹی میں ہمارے ایک مرحوم دوست پروفیسر شکر اللہ کہا کرتے تھے کہ ''خواتین کی بے حرمتی سے متعلق جو خوف ناک واقعات پنجاب میں جنم لیتے ہیں، ان سے بلوچستان کی روایات آشنا نہیں۔ آج بھی آپ ہماری اخلاقی روایات کا یہ کرشمہ دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے قانون شکن ڈاکو جو گاہے گاہے لوگوں کو لوٹتے رہتے ہیں، (خواتین سے متعلق) اخلاقی روایات کے وفادار ہیں۔ مثلاً جب کبھی کوئٹہ سے کراچی جانے والی کسی بس کو تربت میں لوٹا جاتا ہے کہ تو ڈاکو مسافروں سے کہتے ہیں: بیبیاں ایک طرف ہو جائیں۔ چنانچہ وہ خواتین کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ البتہ مردوں سے اپنا 'معاملہ' طے کرتے ہیں۔''

جب خاکسار اُن سے کہتا کہ جاگیرداری کلچر کا ایک 'تحفہ' خواتین کی حرمت و عزت کو پامال کرنا ہے تو وہ کہتے کہ یہاں بھی تو جاگیرداری کلچر ہے۔ لیکن تم کبھی نہیں سنو گے کہ یہاں کسی نے کسی کی ماں بہن کی عزت پر حملہ کیا ہے۔

جب مرحوم پروفیسر موصوف اپنی روایات کو بیان کرتے تو مجھے بالِ جبریل کی ایک نظم: ''بڈھے بلوچ کی نصیحت، بیٹے کو!'' یاد آ جاتی، جس میں علامہ فرماتے ہیں:

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سردارا!

اکبر الٰہ آبادی کے عہد میں خواتین پردہ سے آہستہ آہستہ باہر آ رہی تھیں، جس پر اُنہیں کہنا پڑا

بے پردہ کل جو نظر آئیں چند بیبیاں
اکبر زمین میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

اگر اکبر آج ہمارے درمیان ہوتے اور ان المناک واقعات کو دیکھتے تو دُعا کرتے ''خدایا! اب زمین کا پیٹ اس کی پشت سے بہتر ہے!''

جہاں تک ہمارے سیاسی اور اقتصادی مسائل کا تعلق ہے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس بارے میں نہایت ہی اختصار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم سیاست میں کوئی صحت مند کردار ادا نہ کر سکے اور سیاسی مسائل کو سیاست ہی کے حوالہ سے حل کرنے میں ناکام رہے، کیوں کہ ہم زندگی کے حقائق کو شعر و شاعری کی مئے ناب میں غرق کرتے رہتے ہیں۔

مشرقی پاکستان جیسے اکثریتی صوبے کا مغربی پاکستان سے الگ ہو جانا حالیہ سیاسی دُنیا میں ایک نیا ''تجربہ'' تھا۔ بلکہ ۱۹۷۱ء کے المیہ سے دس سال پہلے ہم نے مشرقی بھائیوں سے کہا تھا کہ تم الگ ہو جاؤ۔ اس پر بہ قول جسٹس منیر (''جناح سے ضیاء تک'' کے مؤلف) مشرقی پاکستان کے رہنماؤں نے کہا تھا کہ کہیں اکثریت بھی اقلیت سے الگ ہوئی ہے۔

اگر ہم اپنے سیاسی اختلافات میں وسعتِ نظر سے کام لیتے تو نہ تو مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوتا اور نہ ہی ہمیں سیاسی اور معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج تک ہمارے ملک میں جتنے صدرِ ریاست یا وزیرِ اعظم آئے ان میں سے ہم نے کسی کو بھی اپنی مدت پوری کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ہر وزیرِ اعظم اور صدر کو بزور الگ کیا گیا۔ کیا ابھی تک وہ وقت نہیں آیا کہ ہم پرامن طریق سے اپنے سیاسی مسائل کو حل کریں اور اسی راہ پر چل کر

اپنے سیاسی رہنماؤں کو اپنی معیاد (Term) پوری کرنے کی اجازت دیں اور پھر پرامن جمہوری طریق ہی سے ان کے جانشینوں کا انتخاب کریں۔

مشہور برطانوی مصنف فشر (Fisher H, A.L.) نے اپنی کتاب: ''تاریخِ یورپ''[1] میں لکھا ہے کہ برطانوی ہندوستان میں انگریز انتظامیہ کے آدمی پانچ ہزار سے زیادہ نہیں تھے، جنہوں نے برطانوی راج کا انتظام سنبھال رکھا تھا، اُنہوں نے ہندوستان میں ۴/۱ کروڑ ایکڑ زمین کو قابلِ کاشت رقبہ بنایا اور ایک ایکڑ بھی ایسا نہیں جس کا اندراج بندوبست اراضی کے رجسٹر میں نہ ہو۔ اس قابل اور اہل انتظامیہ نے ڈیڑھ سو سال تک برطانوی راج کو قائم رکھا۔ اس انتظامیہ نے ملک میں امن و انصاف قائم کیا، تعلیم کو فروغ دیا، حیرت ناک نتائج کو جنم دیا اور ذہین قانون دانوں، اساتذہ اور سیاست دانوں کی جماعت وجود میں آئی۔(۱)

یہی انتظامیہ برٹش راج کے بعد پاکستان کے حصے میں آئی۔ جو یہاں ایک مدت تک سیاسی اور اجتماعی ناہمواریوں کے باوجود کام کرتی رہی۔ حتیٰ کہ مرحوم صدر ایوب خان کے عہد تک یہی انتظامیہ اپنی روایت کو برقرار رکھنے میں کسی حد تک کامیاب رہی۔

وزارتِ صنعت کے ایک پرانے سیکرٹری مسٹر جعفری نے لکھا ہے کہ وہ صدر ایوب سے ملنے گئے۔ جب ملاقات ختم ہوئی تو صدر نے کہا: آپ کے پاس شاید اختر (صدر ایوب کا بیٹا) کی کوئی درخواست آئی ہے۔ تو جعفری صاحب نے کہا، ہاں آئی ہے۔ لیکن وہ قواعد وضوابط کے خلاف ہے۔ صدر ایوب نے کہا، ہاں! قواعد وضوابط کی پابندی ضروری ہے۔ ہماری انتظامیہ کے بارے میں صدر محمد ایوب خان نے اپنی کتاب ''Friends not Masters'' میں لکھا ہے کہ ہمارے سول ملازمین کے برتاؤ میں احساسِ برتری پایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ مرحوم راجہ غضنفر علی خان کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''میرے ایک پرانے دوست راجہ غضنفر علی خان ایران میں ایک لمبے عرصہ تک ہمارے سفیر رہے ہیں۔ ایرانی لوگ بڑے مہذب ہیں۔ راجہ صاحب نے یقیناً ان کی ثقافت اور روایت کو اپنے اندر جذب کیا ہے، جب وہ واپس پاکستان

(1) A History of Europe, London 1937, pp.1020-1022.

آئے تو میں نے اُن سے پوچھا، راجہ صاحب آپ کیسے ہیں؟ میں اچھا (Well) ہوں۔ میں اپنے وطن واپس آیا ہوں۔ مجھے اُمید تھی کہ گرم جوشی سے مجھے خوش آمدید کہا جائے گا۔لیکن میں جس سے ملا، وہ سردمہری سے ملا۔ (ص ۲۷)

جب ۱۹۴۷ء میں پاک و ہند کی نئی تاریخ شروع ہوئی تو پاکستان میں .I.C.S جو اَب .C.S.P کے نام سے معروف ہے، ایک وقت تک کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیئے۔لیکن ایک وقت کے بعد (خاص طور پر صدر محمد ایوب کے بعد) سیاست نے انتظامیہ کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہا تو ہمارے اجتماعی امور میں بگاڑ پیدا ہوا۔ جوں جوں جمہوری، قانونی اور اخلاقی روایات کمزور ہوتی گئیں، بدعنوانی، رشوت اور سیاسی افراتفری زور پکڑتی گئی اور اس نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا المیہ رونما ہوا، لیکن ہم خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ معروف مصری صحافی محمد حسین ھیکل نے الطاف گوہر سے کہا تھا کہ ''آپ نے صدر ایوب کو الگ کر کے بڑا غلط قدم اُٹھایا۔ وہ مسلم دُنیا کے پہلے رہنما تھے جو مغربی رہنماؤں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے۔'' آنے والے واقعات نے بتایا کہ حسین ھیکل کی بات صحیح تھی۔

'نئے عہد' میں سیاست اور انتظامیہ نے کھل کر اپنے حدود سے تجاوز کیا جس سے عام لوگوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ آج بھی عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں سالوں تک طواف کرتے رہتے ہیں، لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ ''شبِ وعدہ'' فریب ہوتا ہے۔

یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بعض اوقات جرم بتائے بغیر ملازمین کو ملازمت سے فارغ کر دیا جاتا، اور بعض کو 'سیکولر' کی تہمت پر الگ کیا گیا۔حتیٰ کہ بعض صوفی منش، اہل اور اخلاقی انسان بھی 'شاہ' کی نگہٗ عتاب کا نشانہ بنے۔ اور عدل و انصاف کو سرِ بازار رسوا کیا گیا۔

غرضیکہ آزاد پاکستان میں برطانوی انتظامیہ کی روایات کو یکسر فراموش کر دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں ہمارے ہاں سیاست بازیچۂ اطفال بن کر رہ گئی۔ اِدھر چند سال پہلے ایک

سیاسی رہنما نے جوشِ خطابت میں فرمایا: ''پاکستان، افغانستان اور بنگلہ دیش کے مسلمان ان شاء اللہ مل کر بھارت کے مسلمانوں کو آزادی دلائیں گے اور دہلی کا لال قلعہ... بھارت کے قبضہ سے آزاد کرائیں گے۔'' (روزنامہ جنگ، پنڈی، ۲۸/دسمبر ۱۹۸۸ء، ص۴)

واقعہ یہ ہے یہ اندازِ سیاست جسے مسلمانوں نے پہلی جنگِ عظیم میں اختیار کیا، مسلمانوں کی شاعرانہ سیاست کا بہترین نمونہ تھا، جب تحریکِ خلافت میں (۲۱-۱۹۲۰ء) برطانوی ہندوستان سے مسلمانوں نے افغانستان کی طرف ہجرت کی، ''جس سے ہزاروں گھر تباہ ہو گئے۔ ہزاروں بچے سایۂ پدری سے محروم کر دیئے گئے۔ گاؤں کے گاؤں مسلمانوں نے آگ لگا کر خاکستر کر دیئے اور لاکھوں کی جائیدادیں کوڑیوں کے مول ہندوؤں کے ہاتھ بیچ دی گئیں۔'' (النور، علی گڑھ، ۱۹۲۱ء)

یہ سیاست برابر ہمارا دل پسند مشغلہ رہی۔ ۱۹۸۰ء میں جب امریکی حکومت نے کابل میں روسی مداخلت کے خلاف جنگ شروع کی تو ہم نے مقدور بھر امریکی حکومت کا ساتھ دیا۔ ۱۹۹۰ء میں جب سویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا، تو ہمارے ''دوست'' ہمیں تقدیر کے حوالے کر کے رخصت ہو گئے۔ اب ہم ہیں اور صحرا نوردی، ہم نے کبھی بھی انفرادی یا اجتماعی طور پر ''اپنی گھات'' میں بیٹھ کر اپنے نفس کا محاسبہ نہیں کیا، کیونکہ ایسا کرنا بہ قول افلاطون انسانی زندگی کا سب سے مشکل مسئلہ ہے۔

اس کے باوجود ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ قومی سطح پر ہم نے سیاسی اور اخلاقی طور پر بڑی ترقی کی ہے۔ قرآن نے فرمایا ''(اے پیغمبرؐ!) آپ فرما کہہ دیجیے: ''کیا تمہیں بتائیں، وہ کون لوگ ہیں جو اپنے کاموں میں سب سے زیادہ نامراد ہوئے؟ وہ جن کی ساری کوششیں دُنیا کی زندگی میں کھوئی گئیں، اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔ (الکہف:۱۰۴)

ہماری اخلاص سے یہ رائے ہے کہ آج ہمارے سامنے اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ نہیں ہے کہ ہم قومی سطح پر بڑی بے رحمی کے ساتھ اپنی قومی زندگی کا محاسبہ کریں کہ کیا ہماری

انتظامیہ اور سیاست اپنے فرائضِ منصبی کے ادا کرنے میں ہر قسم کے سیاسی دباؤ یا سفارش سے آزاد ہے؟ کیا ہماری معیشت نے ہمارے عوام کو ایک باوقار زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا ہے؟ ایک فلاحی معاشرے کے قیام کے لیے کیا ہم نے کوئی ٹھوس معاشی منصوبہ بنایا؟ ہم نے بار بار لکھا ہے کہ ہمیں دوسرے ملکوں مثلاً چین، برطانیہ، ناروے، ڈنمارک وغیرہ کے کامیاب تجربوں سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

غرضیکہ آج ہم اجتماعی، سیاسی اور معاشی طور پر جس مقام پر کھڑے ہیں، وہ گونا گوں مسائل اور مشکلات سے گھرا ہوا ہے۔ ان سے عہدہ برا ہونے کے لیے ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم کس راہ پر چلنا چاہتے ہیں؛ سچائی، خدمتِ خلق اور حقیقت شناسی کی راہ یا بدی، بدیانتی اور ژولیدگیٔ فکر کی راہ ...!

بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست

رشید احمد (جالندھری)